ہندوستان میں باہمی اعتماد و اتحاد اور خوشگوار زندگی گزارنے
کے لئے

مسلمانوں کے مسائل و جذبات

کو

سمجھنے کی کوشش کیجئے!

دانشوروں اور صحافیوں کے ایک چیدہ مجمع میں ایک اہم گفتگو اور
تبادلۂ خیال (DIALOGUE)

از

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

طابع و ناشر
کل ہند مجلس استحکام و یکجہتی۔ لکھنؤ

بار اوّل

۱۴۰۶ھ ۱۹۸۶ء

کتابت ــــــــــ ظہیر احمد کاکوروی

طباعت ــــــــــ لکھنؤ پبلشنگ ہاؤس (آفسٹ)

صفحات ــــــــــ ۴۶

قیمت ــــــــــ تین ۳ روپے

قیمت۔ ہندی و انگریزی ایڈیشن ــــــــــ چار ۴ روپے

باہتمام

محمد غیاث الدین ندوی

طابع و ناشر

کل ہند مجلس استحکام ویکجہتی۔ لکھنؤ

ملنے کے پتے

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام پوسٹ بکس ۱۱۹ لکھنؤ

مکتبۂ دار العلوم ندوۃ العلماء پوسٹ بکس ۹۳ لکھنؤ

عنوانات

"مسلمانوں کے مسائل و جذبات سمجھنے کی کوشش کیجیے"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ڈائلاگ (DIALOGUE) کی ضرورت و افادیت

دوستو! بھائیو اور بزرگو! میں آپ سب کی تشریف آوری اور تکلیف فرمائی کا اپنی طرف سے اور اپنے سب بُلانے والے ساتھیوں کی طرف سے خلوص دل سے خیر مقدم کرتا ہوں، ہمارے دَور اور ہمارے ملک میں سیاسی کانفرنسوں، پارٹیوں کے اجلاس، علمی سیمناروں اور ادبی نشستوں کی کمی نہیں، شاید کوئی دن خالی جاتا ہو کہ کوئی ایسی نشست نہ ہوتی ہو، پریس کانفرنسوں کی بھی کمی نہیں، مگر وہ خاص اغراض کے ماتحت کی جاتی ہیں، اور ان میں بے تکلف تبادلۂ خیال کی نوبت کم آتی ہے، ضرورت ہے کہ رسوم و تکلفات سے آزاد ہو کر جس طرح ایک خاندان یا ایک محلّہ کے لوگ کسی جگہ اکٹھے ہو کر بے تکلّف بات چیت کرتے ہیں، دوستانہ و عزیزانہ گلہ شکایت ہوتی ہے، غلط فہمیاں رفع کی جاتی ہیں، اپنے خاندان یا محلہ کے فلاح و بہبود کے لئے مشورے ہوتے ہیں، بچھڑے ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں، اس طرح ہم کبھی کبھی کسی مرکزی مقام پر جمع ہو کر دوستانہ و بے تکلفانہ گفتگو و تبادلۂ خیال کریں، اسی خیال و تجربہ کے ماتحت (DIALOGUE) زیادہ مفید سمجھا گیا ہے، اور اس کے بہتر نتائج

نکلے ہیں، اسی خیال کے ماتحت آپ حضرات کو آج تکلیف دی گئی ہے۔

مختلف فرقوں کی ایک دوسرے سے لاعلمی یا ناقص واقفیت، اور اس کے اثرات و نقصانات

حضرات! ہندوستان میں تقریباً ایک ہزار برس سے ہندو، مسلمان اکٹھے رہتے ہیں، شہروں، قصبات، دیہاتوں اور محلّوں میں ان کی ملی جلی آبادی اور مشترک سکونت ہے، بازاروں، منڈیوں، تعلیمی مرکزوں، کچہریوں، دفتروں اور اب سو برس سے زیادہ عرصہ ہو رہا ہے کہ سیاسی تحریکات، سماجی کاموں، اسٹیشن اور ڈاک خانوں، ریلوں اور بسوں میں ان کو ایک دوسرے سے ملنے جلنے اور ایک دوسرے کو جاننے پہچاننے کے مواقع آسانی سے میسّر ہیں۔

لیکن یہ دنیا کا حیرت انگیز واقعہ، اور ایک طرح کی پہیلی ہے جس کا بوجھنا آسان نہیں کہ عام طور پر ایک کو دوسرے کے مذہبی عقائد، تہذیب، معاشرت، طور طریق اور قومی خصوصیات سے قریب قریب اتنی بیگانگی اور اجنبیت ہے، جیسی پرانے زمانہ میں اکثر دو ملکوں کے باشندوں کے درمیان ہوا کرتی تھی، ہر ایک کی معلومات دوسرے کے متعلق ناقص، سطحی، سرسری اور زیادہ تر سنی سنائی باتوں اور قیاسات و تخیلات پر مبنی ہیں، ہر فرقہ دوسرے فرقہ کے بارہ میں بہت سی شدید غلط فہمیوں میں مبتلا، اور بعض اوقات منافرت انگیز لٹریچر، سیاسی پروپیگنڈے، زہر آلود اور رنگ آمیز تاریخ، نصاب کی کتابوں اور بے تحقیق داستانوں اور کہانیوں کی بنا پر اپنے ذہن و دماغ میں اس کی ایک غلط اور مکروہ تصویر قائم کئے ہوئے ہے، ایک فرقہ کے کٹّر اور متعصّب نہیں، نیک دل

اور سادہ طبیعت افراد سے اگر دوسرے فرقہ کے بنیادی عقائد، مراسم اور معاشرت کے اصولوں کے متعلق دریافت کیا جائے تو وہ یا تو لاعلمی کا اظہار کریں گے یا ایسے جوابات دیں گے جن سے ایک واقف آدمی کو بے اختیار ہنسی آجائیگی، راقم سطور کو جو بکثرت سفر کرتا ہے اور ریلوں اور بسوں میں ہر طبقہ اور ہر سطح کے لوگوں سے اس کا بکثرت ملنا جلنا ہوتا ہے بارہا اس کا تجربہ ہوا۔

لیکن یہ ہنسی کی بات نہیں، رونے کا مقام ہے! کہ سیکڑوں برس سے ساتھ رہنے کے باوجود ہم ایک دوسرے سے اتنے ناواقف ہیں' اس کی ذمہ داری تنہا ایک فرقہ پر نہیں، سب پر ہے اور خاص طور پر مذہبی، سماجی کام کرنے والوں، اپنے ملک سے سچی محبّت رکھنے والوں' اور انسانیت دوستوں پر ہے کہ انھوں نے ایک کو دوسرے سے صحیح طور پر واقف کرانے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی، یا کی تو ناکافی۔

مہذّب دنیا میں اب یہ اصول تسلیم کرلیا گیا ہے کہ محبّت' احترام و اعتماد اور امن و سکون کے ساتھ رہنے اور نیک مقاصد کے لئے ایک دوسرے سے تعاون اور اشتراک عمل کرنے کے لئے ایک دوسرے سے متعلق صحیح معلومات حاصل کرنا ضروری ہے' آبادی کے ہر عنصر' اور ملک کے ہر فرقہ اور ہر گروہ کو معلوم ہونا چاہئے کہ دوسرا عنصر، دوسرا فرقہ اور گروہ کن اصولوں پر عقیدہ رکھتا ہے، کن ضابطوں کا اپنے کو پابند اور ان کو اپنے لئے ضروری سمجھتا ہے' اس کی تہذیب و معاشرت کا خاص رنگ کیا ہے؟ اس کو زندگی کی کون سی قدریں عزیز ہیں؟ اس کو قلبی سکون اور پُر از اعتماد زندگی گزارنے کے لئے کیا چیزیں درکار ہیں؟ کون سے عقائد و مقاصد اس کو جان سے زیادہ عزیز اور اولاد سے زیادہ پیارے ہیں؟ ہمیں اس سے گفتگو کرنے میں' اس کے ساتھ خوشی اور مسرّت کے ساتھ

وقت گزارتے ہیں کن جذبات و احساسات کا لحاظ رکھنا چاہیئے، بقائے باہم کے لئے (CO-EXISTENCE) (جو شائستہ اور پرسکون زندگی کا مانا ہوا اصول ہے) شرطِ اوّلین ہے کہ ضروری حد تک واقفیت حاصل ہو۔

ایک ایسے ملک کے لئے یہ اصول اور بھی ضروری قرار پاتا ہے، جس کو اپنی رنگارنگ تہذیب پر ناز اور "جیو اور جینے دو" کے زرّیں اصول پر اس کا پرانا عقیدہ ہے، اس وقت ساری دنیا میں دُور دراز ملکوں کے مذاہب اور فلسفوں، تہذیبوں اور معاشرتوں، زبانوں اور کلچروں، لہجوں اور محاوروں، یہاں تک کہ عادات و اخلاق، شوق اور لت (HOBBY) کھیلوں اور تفریحات، کھانوں اور لباسوں کی باریکیوں سے واقف ہوتے کا عام رجحان پایا جاتا ہے، اس کے لئے یونیورسٹیوں میں مستقل مضامین داخل اور مستقل شعبے قائم ہیں، ایک ملک سے دوسرے ملک میں وفود جاتے ہیں، پروفیسرں اور طالب علموں کی ٹیمیں روز آتی جاتی ہیں، یہ بڑے غضب کی بات ہے کہ ایک ہی ملک کے باشندے سیکڑوں برس سے ساتھ رہنے سہنے کے باوجود ایک دوسرے سے اتنے بھی آشنا اور شناسا نہ ہوں، جتنے ایک ملک کے لوگ دوسرے ملک کے لوگوں سے ہوتے جا رہے ہیں۔

اس صورت حال کا نقصان ہندوؤں، مسلمانوں کو یکساں اور نتیجہ کے طور پر ہندوستان کو، بلکہ بالآخر انسانیت کو پہونچ رہا ہے، ملک کے فرقوں کے درمیان بڑی بڑی خلیجیں قائم ہیں، دلوں میں تلخیاں اور دماغوں میں شکوک ہیں، محبت و الفت کے ساتھ رہنے سہنے، ہنسنے بولنے، زندگی کا لطف اٹھانے اور ایک دوسرے پر اعتماد اور ایک دوسرے کی تہذیب اور مسلک کے احترام کی دولت سے (جو زندگی کا حُسن و رونق

اور خدا کی ایک بے بہا نعمت ہے) مجموعی طور پر یہ ملک محروم ہے، اور اس کا نتیجہ ہے کہ بعض فرقوں، اور (اس کے کہنے میں کوئی خوف اور حرج نہیں کہ) خاص طور پر مسلمانوں کی بہترین صلاحیتیں اور توانائی اپنی صفائی اور مدافعت اور اپنے مذہب، تہذیب اور زبان کی حفاظت میں صرف ہو رہی ہے، اور ان کی وہ توانائیاں جو ان کو قدرتی طور پر ورثہ میں ملی ہیں، اور جنھوں نے ماضی میں، زندگی کے مختلف شعبوں میں، اور فلسفہ و تصوّف سے لے کر فنّ تعمیر اور فنون لطیفہ تک، اور مملکت کے نظم و نسق سے لے کر خدمتِ خلق کے میدانوں تک، اپنے روشن اور لافانی نقوش چھوڑے ہیں، ابھی اس ملک کی تعمیر و ترقی میں، اور اس کے استحکام و آراستگی میں اس طرح صرف نہیں ہو رہی ہیں، جیسی صرف ہونی چاہئیں، نفسیاتی طور پر اس کے لئے یہ اطمینان ضروری ہے کہ وہ صحیح طور پر سمجھے جاتے ہیں، ان کو خیالی اور بے جا حد تک نہیں، واقعی اور ضروری حد تک اعتماد اور احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، ان کے اور دوسرے فرقوں کے درمیان دبیز پردے پڑے ہوئے نہیں ہیں، ان کو شک و حقارت اور بےگانگی و اجنبیت کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا ہے، ایک ایسی نسل اور فرقہ کی طرح جو ایک ہزار برس سے ہمارے ساتھ دیوار بہ دیوار اور دوش بدوش رہ رہا ہے، ہم اس کے چہرہ کے خطّ و خال سے واقف، اس کی خوبیوں اور کمزوریوں سے آگاہ اور اور اس کے ماضی و حال سے آشنا ہیں، ہمیں اس کے مذہبی عقائد کا بھی اتنا علم ہے جتنا ان لوگوں کو ہو سکتا ہے، جو ساتھ دینے پر نہیں لیکن ساتھ رہنے پر مجبور ہیں، ان کے رسم و رواج، ان کی تہذیب و معاشرت، ان کے تقریبات و تہواروں، اور ان کی خوشی و غمی سے ہماری واقفیت ایک یورپین سے زیادہ اور ایک ہم وطن

اور ہم سفر کے نمایاں نشان ہے۔

مسلمانوں کی بنیادی خصوصیتیں

اب میں آپ کی اجازت سے مسلمانوں کی چند بنیادی خصوصیات کا تذکرہ کروں گا، جن کا جاننا اور اس کا لحاظ رکھنا ان کے ہر مسئلہ کے سمجھنے اور اس کے حل کرنے کے سلسلہ میں ضروری ہے۔

مسلمانوں کی پہلی بنیادی خصوصیت
معیّن عقیدہ، اور مستقل دین و شریعت

دنیا کے تمام مسلمانوں (اور ہندوستان کے مسلمان بھی اس کلّیہ سے مستثنیٰ نہیں) کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے ملّی وجود کی بنیاد ایک مُعیّن عقیدہ اور ایک مستقل دین و شریعت پر ہے جس کو اختصاراً مذہب[1] کہتے ہیں، (اگرچہ اس سے اس کا

---

[1] دنیا کے بہت سے مذاہب بالخصوص مسیحی دنیا میں، جو خاص تجربوں اور بحرانوں CRISES سے گزری ہے، اور جہاں ریاست STATE زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے اور جس کا شروع سے یہ مقولہ رہا ہے کہ "جو کچھ خدا کا ہے وہ خدا کو دو، اور جو کچھ قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو" مذہب کا ایک بہت محدود مفہوم اور دائرۂ اثر رہ گیا ہے، اور وہاں عام طور پر یہ حقیقت تسلیم کر لی گئی ہے کہ مذہب انسان کا پرائیوٹ معاملہ ہے۔

اسی طرح ہندوستان میں بھی بہت جگہ مذہب یا دھرم صرف عبادات اور چند مذہبی رسوم RITUALS کی تکمیل کا نام رہ گیا ہے، اسلام میں دین کا مفہوم اس سے زیادہ وسیع

(باقی صا۱ پر)۔

صحیح مفہوم ادا نہیں ہوتا، اور وہ لفظی اشتراک کی وجہ سے بہت سی غلط فہمیاں اور التباس پیدا کر دیتا ہے) اسی لئے ان کا ملّی نام، اور عالمگیر لقب کسی نسل، خاندان، دینی پیشوا، بانیٔ مذہب، اور ملک کے بجائے ایک ایسے لفظ سے مشتق ہے، جو ایک مُعیّن عقیدہ اور رویّہ کو ظاہر کرتا ہے، دنیا کی عام مذہبی قومیں اپنے اپنے دینی پیشواؤں، بانیانِ مذاہب، پیغمبروں، ملکوں یا نسلوں کی طرف منسوب ہیں، اور ان کے نام انھیں شخصیتوں یا انھیں نسلوں اور ملکوں کے نام سے مشتق ہیں، جیسے یہودی یہود (JUDAIST) اور بنی اسرائیل (BANI ISRAEL) کہلاتے ہیں، یہودا (JUDAH) حضرت یعقوبؑ کے بیٹوں میں سے ایک بیٹے کا نام اور اسرائیل خود حضرت یعقوبؑ کا نام ہے، عیسائی CHRISTIANS حضرت عیسیٰؑ (CHRIST) کی طرف منسوب ہیں، یا ان کو "نصاریٰ" NAZARENES کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، جس کی نسبت شہر ناصرہ (فلسطین) NAZARETH کی طرف ہے جہاں حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کا بیشتر حصہ گزرا تھا، مجوسیوں کے مذہب کے پیروؤں کا جن کو عام طور پر ہندوستان میں پارسی کے نام سے یاد کرتے ہیں، صحیح نام ZOROASTRIAN یا زرتشتی ہے، جن کی نسبت اس مذہب کے بانی (ZARATHUST) سے ہے، بودھ مذہب ــــــــــ اور بدھ مت (BUDDHISM) اور اس کے ماننے والے اپنے بانی گوتم بدھ (BUDDHA) کی طرف منسوب ہیں، یہی حال

(باقی ص۱۰ کا) اور حاوی ہے، وہ عقائد و عبادات سے لے کر تمدن و معاشرت اور عائلی زندگی کے قوانین پر محیط ہے، اسی لئے وہ زیادہ موثر اور متاثر ہونے والا عنصر ہے، عربی اور قرآنی اصطلاح میں اس کو دین کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کا دائرہ "مذہب" سے زیادہ وسیع ہے۔

ہندوستان کے بیشتر مذاہب کا ہے۔

لیکن مسلمانوں کی نسبت جن کو قرآن شریف اور تمام مذہبی کتابوں اور تاریخوں اور ادبیات میں "مسلمون" اور "اُمّتِ مُسلمہ" کے لقب سے یاد کیا گیا ہے، اور اب بھی دنیا کے ہر گوشہ میں وہ "مُسلم" کے لقب سے جانے پہچانے جاتے ہیں، لفظ اسلام کی طرف ہے، جس کے معنی خدا کی بادشاہی کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا، سپر ڈال دینا، اور اپنے آپ کو حوالہ (SURRENDER) کر دینا ہے، جو ایک مُستقل فیصلہ، ایک مُعیّن رو یّہ، طرزِ حیات اور مسلکِ زندگی ہے، وہ باوجود اپنے پیغمبر سے شدید تعلق کے بحیثیت قوم کے مُحمّدی نہیں کہلاتے، ہندوستان میں پہلی مرتبہ انگریزوں نے ان کو (MOHAMMEDANS) اور ان کے قانون کو (MOHAMMEDAN LAW) کے نام سے موسوم کیا، لیکن ان لوگوں نے جو اسلام کی روح سے واقف تھے، اس پر اعتراض کیا، اور اپنے لئے اسی قدیم لقب "مُسلم" کو ترجیح دی، اور ان اداروں کو جن کا نام انگریزوں کے ابتدائی دور حکومت میں (MOHAMMEDAN COLLEGE) یا محمڈن کانفرنس پڑ گیا تھا، مسلم سے تبدیل کر دیا[۱]۔

---

[۱] مثلاً سر سید احمد خاں مرحوم کے قائم کئے ہوئے مدرسۃ العلوم علی گڑھ کا نام پہلے انگلو محمڈن کالج (ANGLO-ORIENTAL MOHAMMEDAN COLLEGE) تھا، لیکن جب یونیورسٹی قائم ہوئی تو اس کا نام مسلم یونیورسٹی رکھا گیا، اس طرح علی گڑھ کی مشہور تعلیمی کانفرنس کا نام ابتداء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس (MOHAMMEDAN EDUCATIONAL CONFERENCE) تھا، بعد میں اس کو مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے لکھا اور یاد کیا جانے لگا۔

اسی بنا پر "عقیدہ" اور "دین و شریعت" مسلمانوں کے پورے نظامِ زندگی اور ان کی تہذیب و معاشرت میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں، اور وہ قدرتی طور پر ان کے معاملہ میں غیر معمولی طریقہ پر ذکی الحس (SENSITIVE) واقع ہوئے ہیں، ان کے انفرادی اور قومی مسائل پر غور کرنے، نیز قانون سازی، دستور اور آئین، حتیٰ کہ معاشرتی اور اخلاقی امور میں اس بنیادی حقیقت کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔

دینی تسلسل اور اپنی اولاد و نسل کی دینی تعلیم کی اہمیت کی وجہ

اس متعیّن عقیدہ اور دین و شریعت سے وابستگی اور اس کو اپنی اخروی نجات اور دنیوی سعادت کا ذریعہ سمجھنے کا قدرتی و فطری نتیجہ ہے کہ وہ اس کو اپنی اولاد اور آئندہ نسلوں تک منتقل کرنا اور اس اعتقادی و دینی تسلسل کو برقرار رکھنا ضروری سمجھتے ہیں، اور اس بارہ میں (وہ جس تاریخی دور یا جغرافیائی مقام میں ہوں) وہ کسی طرح کی رکاوٹ یا مداخلت پسند نہیں کرتے کہ یہ نہ صرف اس عقیدہ اور دین کی تعلیم کا تقاضہ ہے قرآن مجید میں کہا گیا ہے "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا"[1] (اپنی جانوں اور افرادِ خاندان کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ) اور حدیث میں ہے کہ "تم میں سے ہر ایک اپنے زیردستوں اور زیر تربیت و زیر اثر لوگوں کا ذمہ دار ہے"، بلکہ یہ اولاد اور اپنے وارثوں سے سچی محبت کا بھی تقاضا ہے، اور ہر قوم کا فطری حق ہے کہ آدمی جو اپنے لئے پسند کرتا ہے، وہ اپنی عزیز اولاد و افرادِ خاندان کے لئے بھی پسند کرے۔

---

[1] سورۃ التحریم - ٦

اس بنا پر مسلمان جس ملک جس ماحول میں رہیں وہ اپنی آئندہ نسل تک اپنے عقائد وخصائص منتقل کر سکنے اور بقدر ضرورت اس کا انتظام و تحفظ کر سکنے کی آزادی کو ضروری سمجھتے ہیں، اور اس کی عدم موجودگی اور اس کی ضمانت و آزادی نہ ہونے کی صورت میں وہ اپنے کو حقیقی طور پر ملک کا آزاد و باعزت شہری سمجھنے سے قاصر ہیں، اس دینی تعلیم کی آزادی اور بنیادی عقائد کے تحفظ کے نہ ہونے کی صورت میں ان کو ایسی ہی بے چینی محسوس ہوتی ہے، جیسی مچھلی کو پانی سے نکال کر خشکی پر ڈال دینے یا انسان کو سانس لینے کے لئے ہوا سے محروم کر دینے سے ہوتی ہے، میں اس موقعہ پر بے تکلف یہ بھی عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ مسلمان کے لئے دین و مذہب سے محرومی یا اس کی تبدیلی کا مفہوم ایسا وحشت ناک تصور ہے جو میرے محدود علم میں کسی مذہب یا تہذیب میں نہیں ہے۔

یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ مسلمان نہ صرف سکولر (SECULAR) حکومت کا مفہوم اور اس کے فرائض اور دائرۂ کار سے واقف ہیں، بلکہ اس کی قدر اور تائید بھی کرتے ہیں، اور اس کو ہندوستان جیسے کثیر المذاہب اور رنگا رنگی تہذیب و ثقافت رکھنے والے ملک کے لئے موزوں ترین طریق حکومت اور پالیسی سمجھتے ہیں، اس لئے وہ یہ ذمہ داری حکومت پر عائد نہیں کرتے کہ وہ ان کے بچوں کی مذہبی تعلیم کا انتظام کرے، وہ صرف دو چیزیں چاہتے ہیں، ایک یہ کہ ان کو اس مذہبی تعلیم کا رضا کارانہ نظام قائم کرنے سے روکا نہ جائے اور اس میں قانونی و انتظامی دقتیں نہ پیدا کی جائیں، دوسرے سرکاری مدارس میں ایسی تعلیم مذہبی عقائد و رسوم اور روایات کی شکل میں نہ دی جائے جس سے کسی ایک مذہب کے عقائد و مسلّمات کی تبلیغ ہوتی ہو،

یا ان کے بنیادی عقیدۂ توحید و رسالت کی تردید اور بیخ کنی ہوتی ہو۔

دوسرے درجہ میں ان کو اپنی وہ زبان بھی عزیز ہے اور اس کو باقی رکھنا چاہتے ہیں جس میں ان کا سب سے بڑا مذہبی، تہذیبی اور ثقافتی سرمایہ ہے، میری مراد اُردو سے ہے جس سے رشتہ منقطع ہو جانے سے وہ نسلی خلا GENERATION GAP پیدا ہو جاتا ہے جس کی کوئی باشعور قوم اجازت نہیں دے سکتی، یہ حقیقت ہے کہ اب کسی کتب خانہ یا کتابی ذخیرہ کو نذر آتش کر دینے اور برباد کر دینے کی ضرورت نہیں، صرف رسم الخط (SCRIPT) بدل دینا کافی ہے، اس قوم کا رشتہ اپنے ماضی سے، اپنی تہذیب سے اور اگر اس میں مذہبی سرمایہ ہے تو مذہب سے خود بخود منقطع ہو جائے گا، اس لئے مسلمان اپنے ملّی وجود اور تشخّص کو برقرار رکھنے کے لئے اردو زبان کی بقا اور اس کے پڑھنے اور سیکھنے کے مواقع کے باقی رہنے اور (حکومت کی سطح پر) اس کی تعلیم کی سہولت کو ضروری سمجھتے ہیں، اور اس کے لئے جدّوجہد کر رہے ہیں، اور حکومت اور سرکاری نظام تعلیم سے اس بارہ میں ضروری حد تک تعاون و امداد کا مطالبہ کرتے ہیں، اس موقعہ پر اس سے زیادہ تفصیل سے عرض کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ ایک مستقل موضوع ہے، اور اس پر پورا لٹریچر اور تحریک موجود ہے۔

مسلم پرسنل لا کی اہمیّت کی وجہ

اسی طرح یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیئے کہ ان چند قوانین کو مستثنیٰ کر کے جو مقامی رواج، عرف (CONVENTION) یا جاگیردارانہ نظام کے اثر سے مسلمانوں نے اختیار کئے اور ان کو انگریزی دور میں محمڈن لا میں شامل کر دیا گیا،

ان کا شخصی اور عائلی قانون (PERSONAL LAW) کا اصل اور بنیادی حصّہ قرآن شریف سے ماخوذ ہے، اور اس کی تفصیلات و جزئیات اور تشریحات حدیث و فقہ پر مبنی ہیں۔

ان میں کچھ حصہ ایسی وضاحت و قطعیت کے ساتھ قرآن مجید میں آیا ہے، یا وہ ایسے تواتر کے ساتھ ثابت اور ایسے تسلسل کے ساتھ اس پر عمل رہا ہے، یا اس پر علماء کا ایسا اجماع ہو چکا ہے کہ اس کا انکار کرنے والا اب اصولی و قانونی لحاظ سے دائرۂ اسلام سے خارج سمجھا جائیگا، اور خواہ اس کی تشریح اور عملی تطبیق (APPLICATION) میں کتنا ہی زمانہ کا لحاظ کیا جائے، اس میں تغیّر و تبدّل اور ترمیم کا کوئی سوال نہیں، اس معاملہ میں کسی مسلم اکثریت کے ملک کی نمائندہ حکومت اور مجلس قانون ساز کو بھی کسی تبدیلی کا اختیار نہیں اور بالفرض اگر ایسا کیا گیا یا کرنے کا ارادہ ہے تو یہ ایک تحریف کا عمل اور مداخلت فی الدین کے مرادف ہے، البتہ جو تمدّنی مسائل اجتہادی ہیں، ان کے بارے میں کوئی نصّ قرآنی (قرآن کا صریح حکم) یا قطعی حدیث نہیں ہے، مسلم دانشوروں اور ماہرین فقہ (جو مسائل کے استنباط کی اہلیت رکھتے ہیں) ضروری بحث و نظر کے بعد مقاصد و اصولِ دین اور جدید حالات و تغیرات کی رعایت کرتے ہوئے، ان کو وقت اور عملی زندگی سے ہم آہنگ بنا سکتے ہیں، اور یہ عمل (PROCESS) تاریخ اسلام کے ہر دور میں جاری رہا ہے، اور اس کا اتنا بڑا ذخیرہ مسلمانوں کے پاس (فقہ و فتاوے کی شکل میں) موجود ہے جس کی نظیر کسی دوسری ملّت کے پاس ہمارے علم میں نہیں ہے۔

مسلمانوں کا اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تعلق

ان کی دوسری خصوصیت ان کا اپنے پیغمبر سے گہرا تعلق ہے، ان کے یہاں پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیثیت محض ایک بڑے انسان، قابلِ تعظیم شخصیت اور نہ سہی پیشوا کی نہیں، ان کا تعلق آپ کی ذات کے ساتھ اس سے کچھ زیادہ، اور اس سے کچھ مختلف ہے، جہاں تک آپ کی عظمت کا تعلق ہے اس کو اس مشہور مصرعہ سے زیادہ بہتر طریقہ پر ادا نہیں کیا جا سکتا کہ۔ ؏

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

ان کو آپ کے بارہ میں تمام مشرکانہ خیالات اور اس غلو و مبالغہ سے بھی روکا گیا ہے، جو بعض پیغمبروں کی امتوں نے اپنے پیغمبر کے متعلق روا رکھا ہے، ایک صحیح حدیث میں صاف طریقہ پر آیا ہے کہ "مجھے میری حد سے نہ بڑھانا، اور میرے بارہ میں اس مبالغہ سے کام نہ لینا جو عیسائیوں نے اپنے پیغمبروں کے بارے میں روا رکھا ہے، کہنا ہو تو یوں کہنا کہ "خدا کا بندہ اور خدا کا رسول"۔

لیکن اس معتدل عقیدہ اور تعظیم کے ساتھ مسلمانوں کو اپنے پیغمبر کے ساتھ وہ جذباتی لگاؤ، وہ قلبی ربط و تعلق ہے، جو ہمارے محدود علم و مطالعہ میں کسی قوم و ملت میں اپنے پیغمبر کے ساتھ نہیں پایا جاتا، یہ کہنا صحیح ہو گا کہ ان میں اکثر افراد آپ ؐ کو اپنے والدین، اولاد اور جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں، اور آپ کے ناموس مبارک کی حفاظت اپنا فریضہ جانتے ہیں، وہ کسی وقت بھی ناموس مبارک پر آنچ آنے تک کو برداشت نہیں کر سکتے، وہ اس معاملہ میں اتنے جذباتی اور حساس واقع ہوئے ہیں کہ

ایسے نامبارک موقعہ پر وہ بے قابو ہو جاتے ہیں، اور اپنی زندگیوں کو قربان کر دینے سے بھی نہیں ہچکچاتے، ہر دور میں اس بیان کی صداقت کے لئے واقعات اور دلائل ملیں گے، آج بھی آپؐ کا نام، آپؐ کا ناموس، آپؐ کا شہر، آپؐ کا کلام، آپؐ سے نسبت رکھنے والی چیزیں مسلمانوں کے لئے محبوب ترین اشیاء ہیں، اور وہ ان کے خون اور اعصاب میں حرکت و حرارت پیدا کرتی رہتی ہیں۔

یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس بارہ میں صدیوں سے ہندوستانی مسلمانوں کو دنیائے اسلام میں ایک امتیاز حاصل رہا ہے، اس کے متعدد تاریخی، علمی و جغرافی، نسلی اور نفسیاتی اسباب ہیں جن کا تجزیہ و تشریح ادب و شاعری، مذہب و تصوف، اور نفسیات پر بحث و تحقیق کرنے والے مصنّفین کا کام ہے، یہاں اتنا کہنا کافی ہے کہ آخری صدیوں میں بہترین نعت گو شاعر اس ملک میں پیدا ہوئے اور سیرت نبویؐ پر بہترین کتابیں (جن کا لوہا عرب و مسلم ممالک میں بھی مانا گیا، اور ان سے فائدہ اٹھانے اور مختلف زبانوں میں ترجمہ کرنے کی تحریک پیدا ہوئی) آخری دور میں ہندوستانی مصنّفین کے قلم سے اردو زبان میں نکلیں۔

قرآن مجید سے تعلق

یہی معاملہ ان کا قرآن مجید کے ساتھ ہے، کہ وہ اس کو محض دانشمندی، اخلاقی نصائح اور معاشرتی قوانین کا کوئی مجموعہ نہیں سمجھتے، جو کسی درجہ میں قابلِ احترام ہیں، اور جب سہولت سے ممکن ہو اس پر عمل کر لیا جائے، بلکہ وہ اس کو اوّل سے لے کر آخر تک لفظاً و معنیً خدا کا کلام اور وحی الٰہی سمجھتے ہیں جس کا ایک ایک حرف

اور ایک ایک نقطہ محفوظ ہے، اور اس میں کسی شوشہ کی تبدیلی بھی نہیں ہوسکتی، وہ اس کو ہمیشہ باوضو پڑھتے اور اونچی جگہ رکھتے ہیں، اُن میں اس کے مکمّل طور پر حفظ کرنے اور اچھے سے اچھے طریقہ پر پڑھنے کا بھی خاص اہتمام و رواج ہے، خود ہندوستان میں قرآن مجید کے حفّاظ کی تعداد ہزاروں سے متجاوز لاکھوں تک پہونچی ہوئی ہے، رمضان المبارک میں تراویح کی نمازیں (جو دن کی آخری نماز عشاء کے بعد ہوتی ہے) مساجد میں کم سے کم ایک بار پورے قرآن مجید کے پڑھنے اور سننے کا عام رواج ہے، اور مشکل سے کوئی آباد مسجد اس سے خالی ہوتی ہے۔

ان دونوں (پیغمبر اور قرآن) کے بعد ان کا دینی و جذباتی تعلق مسجدوں، مرکز اسلام (مکہ مدینہ) اور مقاماتِ مقدسہ سے بھی ہے، ان کے عقیدہ میں مسجد ایک مرتبہ بن کر مسجد رہتی ہے اس پر نہ کسی کا قبضہ ہوسکتا ہے، نہ وہ فروخت ہوسکتی ہے، یہ تعلق عقلی اور عملی طور پر ان کی سچی حبّ الوطنی اور ملک کے ساتھ وفاداری کے کسی طرح منافی اور اس پر اثر انداز نہیں کہ ان دونوں میں کسی طرح کا تضاد نہیں، یہ ان کے عقیدہ، جذبۂ احسانمندی کا نتیجہ ہے (کہ جس سے آدمی کوئی نعمت پاتا ہے، یا اس کو اس کی وجہ سے سیدھا راستہ ملتا ہے، اور روشنی حاصل ہوتی ہے، اس کا شکر گزار اور احسانمند ہوتا ہے) اور یہ ان کے مطالعۂ تاریخ کا بھی نتیجہ ہے، اور اس سے کسی حسّاس، باضمیر اور شریف فرد اور قوم کو روکا نہیں جاسکتا۔

صرف مسلمانوں ہی نہیں کسی فرقہ، قوم یا آبادی کے متمیّز عنصر کی قوتِ عمل، توانائی اور خدا کی بخشی ہوئی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے اور اس کے تعاون سے ملک کی تعمیر و ترقی میں فائدہ اٹھانے اور ملک میں اتحاد و اعتماد، خوش دلی اور گرمجوشی کی فضا قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس ملّت یا فرقہ کے بنیادی

عقائد، اس کے مذہبی جذبات اس کے نازک شعور اور "حساسیت" ——— (SENSITIVITY) کا لحاظ رکھا جائے، اور ان شخصیتوں یا حقیقتوں کا احترام ملحوظ رہے جن کی عظمت و عقیدت یا محبت صدیوں سے اس کے رگ و ریشہ میں پیوست ہو چکی ہے، اور جن کی اہانت سے (جو اکثر اوقات بے ضرورت ہوتی ہے) بڑے بڑے قومی و ملکی مفادات کو نقصان پہونچ جاتا ہے۔

اتنا ہی نہیں بلکہ بالغ نظری، حق پسندی، سچی حب الوطنی اور حق ہمسائگی کا تقاضا ہے کہ اگر اس قوم یا فرقہ کا کوئی ایسا مسئلہ سامنے آجائے، جو حق و انصاف پر مبنی ہے، اور اس بارہ میں وہ قوم یا فرقہ کسی ظلم و زیادتی کا نشانہ یا نشۂ قوت کا شکار ہے، تو اس میں اس کی حمایت و تائید کی جائے، اور اس مسئلہ میں اس قوم یا فرقہ کے شانہ بشانہ حق کی حمایت کی جائے اور مظلوم کا ساتھ دیا جائے۔

گاندھی جی کی بالغ نظری، حق پسندی اور اس کا فائدہ

اس بالغ نظری، حق پسندی، اور اپنے ہم وطنوں کی ایک صحیح مسئلہ اور موقف میں نہ صرف تائید و حمایت بلکہ قیادت کی درخشاں مثال گاندھی جی کے اس تاریخ ساز طرز عمل میں ملتی ہے، جو انھوں نے ۱۹۱۹-۲۰ء کی شہرۂ آفاق خلافت تحریک کی تائید کر کے پیش کی، اور جس سے ہندوستان کے اتحاد اور جنگ آزادی کو وہ بیش بہا فائدہ پہونچا جس کی مثال نہ اس سے پہلے ملتی ہے، نہ اس کے بعد، ہم یہاں پہلے ان کی کتاب SEARCH FOR TRUTH (تلاش حق) کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں، پھر تحریک آزادی کی تاریخ سے اس کے فوائد و اثرات کا جائزہ لیں گے۔

گاندھی جی لکھتے ہیں :-

"کانگریس کی طرف سے پنجاب کی ڈائرشاہی کی تحقیقات ابھی شروع ہی ہوئی تھی، میرے پاس ہندو مسلمانوں کی اس مشترکہ کانفرنس میں شریک ہونے کی دعوت آئی، جو مسئلہ خلافت پر غور کرنے کے لئے دہلی میں ہو رہی تھی، اس دعوت نامہ پر منجملہ اور لوگوں کے حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم اور مسٹر آصف علی کے دستخط تھے، اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ کانفرنس میں سوامی شردھانند جی بھی شریک ہوں گے، جہاں تک مجھے یاد ہے سوامی جی اس کانفرنس کے نائب صدر منتخب ہوئے تھے، اور اس کا اجلاس نومبر میں قرار پایا تھا، اس کانفرنس کا مقصد اس صورتِ حال پر غور کرنا تھا، جو خلافت کے معاملہ میں حکومت کی بدعہدی سے پیدا ہو گئی تھی، اور یہ طے کرنا تھا کہ کانفرنس میں علاوہ خلافت کے گئؤ رکشا کے مسئلہ پر بھی بحث ہو گی اور یہ اس کے طے کرنے کا بہترین موقعہ ہے، مجھے گئؤ رکشا کا ذکر اس سلسلہ میں پسند نہیں آیا، میں نے اس دعوت نامہ کے جواب میں جو خط لکھا اس میں شرکت کا وعدہ کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کی کہ ان دونوں مسئلوں کو گڈمڈ نہیں کرنا چاہیئے، اگر ان دونوں کے متعلق بحث کرنا ہے تو اس طرح نہ کیجئے جیسے سودا چکایا جاتا ہے بلکہ دونوں کے حُسن و قبح پر الگ الگ غور کیجئے۔

یہ خیالات دل میں لئے ہوئے کانفرنس میں گیا، اس میں مجمع بہت کافی تھا، مگر اتنا نہیں جتنا اس کے بعد کے جلسوں میں ہوا، میں نے اس مسئلہ پر

جس کا ذکر آچکا ہے سوامی شردھانند جی آنجہانی سے گفتگو کی، انھوں نے میری تجویز کو پسند کیا اور کہا کہ آپ اسے کانفرنس میں پیش کیجئے، میں نے حکیم صاحب سے بھی مشورہ کر لیا، کانفرنس میں میں نے یہ کہا کہ اگر خلافت کا مسئلہ جیسا کہ میں سمجھتا ہوں حق پر مبنی ہے، اور اگر حکومت نے اس معاملہ میں صریح بے انصافی کی ہے، تو ہندوؤں کا فرض ہے کہ وہ اس کی تلافی کے مطالبہ میں مسلمانوں کا ساتھ دیں، ان کے لئے یہ بات نازیبا ہے کہ اس موقعہ پر گئو رکشا کا مسئلہ بیچ میں لائیں اور صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں سے سودا چکائیں، اور مسلمانوں کے لئے بھی اس شرط پر گاؤکشی بند کرنا نامناسب ہے کہ ہندو خلافت کے معاملہ میں اُن کا ساتھ دیں، یہ دوسری بات ہے کہ مسلمان ہندوؤں کے مذہبی جذبات کے لحاظ سے ہمسائگی اور ملکی برادری کے حقوق کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اپنی خوشی سے گاؤکشی ترک کردیں"۔[1]

مسٹر اندولال کے۔ یاگنک (INDULAL K. YAJNIC) اپنی انگریزی کتاب (GANDHI AS I KNOW HIM) میں گاندھی جی کی تحریر کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں، وہ تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"مختصر دعویٰ یہ ہے کہ سلطنت ترکیہ میں جتنی غیر مسلم نسلیں آباد ہیں، ان کی حفاظت کی پوری ذمہ داری لے کر پوری ترکی کو ترکی کے قبضہ میں رہنا چاہیئے، مقدس مقامات اور جزیرۂ عرب یعنی ملک عرب حسب تعریف علمائے اسلام پر سلطان کا اقتدار بدستور قائم رہے، البتہ اگر اہلِ عرب

---

[1] تلاش حق ص ۳۰۸-۳۰۹ ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین۔

چاہیں تو وہ خود اختیاری حکومت کے حقوق ہر وقت حاصل کر سکتے ہیں۔

مجھے مسئلہ خلافت کی تفصیلات میں پڑنے کی ضرورت نہ تھی، میرے اطمینان کے لئے یہی کافی تھا کہ مسلمانوں کے مطالبات میں کوئی چیز ناجائز اور غیر معقول نہ تھی..... مجھے محسوس ہوا کہ خلافت کے متعلق مسلمانوں کا مطالبہ نہ صرف مبنی بر انصاف تھا، بلکہ برطانیہ کے وزیر اعظم نے بھی ان کے مطالبہ کی صداقت کو تسلیم کر لیا تھا، اس لئے میں نے اپنا فرض سمجھا کہ وزیر اعظم کے اس وعدہ کو پورا کرانے کے لئے جو کچھ بھی میرے امکان میں ہے دریغ نہ کروں۔

یہ تھی وہ نازک دلیل جس کی بناء پر قبل اس کے کہ تحریک خلافت کو وہ اہمیت حاصل ہو جو اسے بعد میں ملنے لگی، گاندھی جی نے مطالبۂ خلافت کی تائید اپنے لئے لازمی قرار دے دی۔[۱]

مشہور نیشلسٹ مسلمان دانشور اور تحریک خلافت کے ایک باوثوق مؤرخ قاضی محمد عدیل عباسی صاحب اپنی کتاب "تحریک خلافت" میں گاندھی جی کی سرگرمیوں اور مصروفیتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"گاندھی جی زمین کا گز بنے ہوئے چاروں طرف دوڑ رہے تھے، خلافتِ اسلامیہ سے جو ہمدردی انھوں نے ظاہر کی اور جس خلوص سے وہ مسلمانوں کے ساتھ میدان میں آگئے اس کا اثر ہر کہہ و مہہ پر تھا، اور بہت جلد وہ مسلمانانِ ہند کے مسلّمہ لیڈر بن گئے۔

۱ے ترجمہ مولانا ظفر احمد انصاری۔ ص ۳۷-۳۸

دوسری خلافت کانفرنس (دہلی) زیر صدارت مولوی فضل الحق کے سلسلہ میں ۲۴ر نومبر ۱۹۱۹ء کے متحدہ اجلاس کا حال اخبارات میں اس طرح بیان کیا گیا ہے :-

"اس کے بعد گاندھی جی نے تقریر فرمائی جس میں آپ نے خلافت کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے، ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا اور کہا کہ اگر مسلمانوں کے دل رنجیدہ ہیں تو ہندو ان کے ساتھ شریک ہیں .... اس کے بعد گاندھی جی نے خلافت کمیٹی کے لئے چندہ کی اپیل کی اور بذات خود ایک پیسہ تبرکاً عنایت کیا، بس کیا تھا، یہ پیسہ نیلام ہوا اور اسے ۵۰۱ روپیہ میں سیٹھ چھوٹانی نے خریدا، ایک ہزار نقد چندہ وصول ہوا، اور ڈیڑھ ہزار کا وعدہ ہوا۔"[1]

اپریل ۱۹۲۴ء کے "ینگ انڈیا" میں گاندھی جی نے خود لکھا :-

"خلافت کی یہی تحریک ہے جس نے قوم کو بیداری عطا کی، اب میں پھر اسے سونے نہ دوں گا۔"[2]

قاضی محمد عدیل عباسی لکھتے ہیں :-

"جو نظارہ ہندو مسلم اتحاد کا خلافت تحریک کے زمانہ میں آنکھوں کے سامنے آیا، اس کو پھر دیکھنے کے لئے آنکھیں ترس گئیں، تحریک آزادی نے عوام کے دل و دماغ پر قبضہ کر لیا تھا، اب صرف ایک جذبہ کار فرما تھا، کہ انگریز کو ہندوستان سے نکال باہر کیا جائے، اور اس لئے سارا ہندوستان

---

[1] تحریک خلافت ص ۱۴۴-۱۴۶ قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم۔

[2] ایضاً ص ۲۷۱

پھٹے کپڑوں، ننگے سر اور ننگے پیر والے رضا کاروں سے بھر گیا، لوگ اپنا کام کاج چھوڑ کر نکل آئے اور صرف تین نعرے ہندو مسلمان مل کر لگاتے تھے، "اللہ اکبر" مہاتما گاندھی کی جے، مولانا محمد علی کی جے، کالجوں اور اسکولوں سے ہندو اور مسلمان لڑکے نکل پڑے اور دوش بدوش کام شروع کر دیا، ایک لہر تھی جو موج دریا کی طرح رواں دواں تھی، کہیں اختلاف یا نفرت کا ایک دوسرے سے نام و نشان نہ تھا۔"[1]

گاندھی جی کی یہی بالغ نظری، حقیقت پسندی اور وسیع القلبی تھی جس کے نتیجہ میں ہمارے ملک میں ہندو مسلم اتحاد کا ایسا نظارہ دیکھنے میں آیا جو نہ اس سے پہلے نظر آیا تھا، نہ اس کے بعد، اور جس کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ سارا ملک غیر ملکی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا، اور بالآخر اس کو اس ملک کی حکومت سے دستبردار ہو کر اس کو اہل ملک کے حوالہ کرنا پڑا۔

برعکس اور ناقابلِ فہم طرزِ عمل

اس کے بالکل برعکس ذہنیت اور طرزِ عمل کی میں ایک ایسی مثال پیش کرتا ہوں جو ان سطور کے لکھنے کے وقت تک قائم ہے، اور جو اس وقت مجلسوں، کانفرنسوں، سیمناروں، اخبارات و رسائل کا موضوع بنی ہوئی ہے، بلکہ گھر گھر مجلس مجلس اس کا تذکرہ ہے، یہ وہ صورتِ حال ہے جو سپریم کورٹ کے ۲۳ راپریل ۱۹۸۵ء کے شاہ بانو کیس کے فیصلہ نے پیدا کر دی ہے، سپریم کورٹ کے فاضل چیف جسٹس چندر چوڑ نے

---

[1] تحریک خلافت ص ۲۷۱-۲۷۲ قاضی محمد عدیل عباسی، مطبوعہ ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی۔

یہ فیصلہ دیا کہ مسلمان مطلّقہ خاتون کو اس وقت تک جب تک وہ دوسری شادی کرے، اور شادی نہ کرنے کی صورت میں حین حیات طلاق دینے والے شوہر کی طرف سے گزارہ (نان نفقہ) (MANTENANCE) دیا جانا ضروری ہے، جس کے لئے دلیل اور جواز قرآن مجید کے لفظ "متاع" سے فراہم کیا گیا، جس کا ترجمہ انگریزی کے ان بعض مترجمین نے تفسیر اور عربی زبان سے گہری اور تفصیلی واقفیت نہ ہونے اور سیاق و سباق کا لحاظ کئے بغیر (MAINTENANCE) سے کیا ہے، فیصلہ کی تمہید میں اس کا دعویٰ کیا گیا کہ اسلام میں عورت کو اس کا جائز اور فطری مقام نہیں دیا گیا، اور اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا ہے، اور اس طرح اس نئے فیصلہ اور قانون کے ذریعہ اس کے حقوق کا تحفّظ کیا جانا ضروری ہے۔

اس فیصلہ کے انداز تحریر اور اس سے جو وسیع اور عمیق اثرات مرتّب ہوتے ہیں، اس کے خلاف مسلمانوں میں ایک ایسا شدید ردِّ عمل اور بے چینی کی ملک گیر لہر پیدا ہوئی جس کی مثال (اگر مؤرّخانہ احتیاط سے کام لیا جائے) تو تحریک خلافت کے بعد نہیں ملتی، اس نے مسلمانوں کے تمام مکاتبِ فکر (SCHOOLS OF THOUGHT) اور فقہی مسلکوں کو اس طرح متّحد کر دیا، اور اس کے خلاف یک آواز بنا دیا، جس کی مثال عرصۂ دراز سے کم سے کم اس ملک میں دیکھنے میں نہیں آئی، سری نگر سے لے کر کنیا کماری تک اور خلیج بنگال سے لے کر بحر عرب کے کنارہ تک اتنے عظیم جلسے ہوئے، جن کی نظیر دُور دُور اور دیر دیر تک نظر آنی مشکل ہے، جن میں ہزاروں انسانوں سے لے کر لاکھوں تک حاضرین کی تعداد پہونچتی ہے، جو اس جذبہ، ذوق و شوق، اور جوش و خروش کے ساتھ شریک ہوئے، جو صرف ایمان و عقیدہ،

حق و صداقت پر یقین اور اپنی جان سے زیادہ عزیز مذہب کے لئے خطرہ کا احساس ہی مذہب کو ماننے والی کسی قوم کو جمع کرسکتا ہے۔

میں صرف اپنے وطن رائے بریلی کی مثال دیتا ہوں جو نسبتاً ایک چھوٹا شہر ہے جس کی آبادی ایک لاکھ سے زیادہ نہیں، ۹ فروری ۱۹۸۶ء کو وہاں جو جلسہ تحفظ شریعت کے نام سے چند نوجوان کارکنوں کی طرف سے منعقد کیا گیا (جو کوئی سیاسی یا دینی و علمی شہرت نہیں رکھتے تھے) اس میں حاضرین کی تعداد کا محتاط اندازہ ایک لاکھ سے زائد کا تھا، لوگ اپنے جذبہ اور شوق سے مختلف اضلاع سے مستقل بسیں اور اپنے کھانے پینے کا انتظام کرکے آئے تھے، بڑے اور مرکزی شہروں کے جلسوں کی وسعت اور کامیابی کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

سپریم کورٹ کے اس فیصلہ کے بارہ میں مسلمانوں کی اس بے چینی کے تین اسباب تھے۔

۱۔ پہلا یہ کہ اس سے ان کے آئینی قانون پرسنل لا میں مداخلت کا دروازہ کھلتا ہے اگر وہ اس پر خاموش رہتے ہیں، تو ان کے اس عائلی قانون کے (جس کو وہ اپنے مذہب کا جزء اور قرآن و سنت کے صریح احکام پر مبنی سمجھتے ہیں) سارے اجزاء خطرہ میں پڑ جاتے ہیں، اور ایسا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جس کے کہیں رکنے کی کہیں کوئی ضمانت نہیں، اور اس سے ان کا اپنے مذہب پر آزادی سے عمل کرنے اور ہندوستان میں اپنے ملی تشخص کو قائم رکھنے کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں، اور وہ زندگی کے دریا میں مچھلیوں کی طرح زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، جن کی کوئی شناخت نہیں، اور جب مچھلیوں کا ذکر آ گیا تو میں کہتا چلوں کہ جہاں تک مسلمانوں کے بنیادی عقائد کا تعلق ہے، وہ اپنی شریعت کے بغیر اسی طرح معنوی طور پر زندہ نہیں

رہ سکتی جیسے جسمانی طور پر مچھلی پانی سے باہر زندہ نہیں رہ سکتی۔

۲۔ ان کی بے چینی اور اس فیصلہ سے بے اطمینانی کا دوسرا سبب یہ ہے کہ ان کے نزدیک ان کی شریعت مُطلّقہ خاتون کو اس سے زیادہ تحفظ فراہم کرتی اور باعزت زندگی کے وسائل و مواقع مہیا کرتی ہے جتنا سپریم کورٹ کے فیصلہ نے اس کا انتظام تجویز کیا ہے، اور یہ اس سے کم وقت میں اور زیادہ سہولت وعزت کے ساتھ ہو سکتا ہے، جتنا عدالت اور انتظامیہ کے ذریعہ سپریم کورٹ کے فیصلہ کی بنا پر ممکن ہے۔

معترضین کا کہنا ہے کہ اگر طلاق کے بعد سابق شوہر سے سابق بیوی کو نان نفقہ نہ دلوایا گیا تو وہ بے سہارا رہ جائیگی، مگر نان نفقہ کے متعلق شریعت کا بندوبست جو زیر بحث بِل میں شامل کر لیا گیا ہے، اس بندوبست سے کہیں بہتر ہے، جس کی وکالت شاہ بانو والے مقدمہ میں سپریم کورٹ کے فیصلہ کے حمایتی کر رہے ہیں، اس فیصلہ کے تحت ایسی مُطلّقہ عورت کے نان نفقہ کی ذمہ داری جو اپنی گذر بسر خود نہ کر سکے اور جس نے طلاق کے بعد شادی نہ کی ہو، صرف ایک شخص یعنی اس کے سابق شوہر پر ڈالی گئی ہے، اور اگر یہ شخص نادار ہو یا اس کا انتقال ہو جائے تو اس کی سابق بیوی کے لئے کوئی سہارا نہیں رہ جائے گا، جبکہ بِل کے تحت ایسی عورت کی کفالت اس کے بہت سے رشتہ داروں پر، اور اگر وہ سب نادار ہوں تو وقف بورڈ پر عائد ہو گی۔

اس موقعہ پر اس اخلاقی اور نفسیاتی فرق اور نتائج کو بھی خیال میں رکھنا چاہئے جو ایک ایسے مرد سے گذارہ (نان نفقہ) حاصل کرنے میں اور اس کے

برخلاف اپنے قریبی عزیزوں سے جو اس کی وراثت پانے کے مستحق ہیں، اور جن کا رشتہ ازدواجی تعلق پر منحصر نہیں خون اور نسل و نسب کا رشتہ ہے ایک شریف و خوددار عورت پر مرتّب ہوتے ہیں، کیا ایک شریف اور خوددار عورت کے لئے یہ زیادہ موزوں و مناسب ہے کہ وہ اس مرد سے آذوقۂ حیات حاصل کرے جس نے طلاق دے کر اس کو اپنے گھر سے نکال دیا ہے، یا اپنے ان خونی رشتہ داروں سے جو اب بھی اس سے محبت اور اس کا احترام کرتے ہیں، اس کا جواب ضمیر و عقل سلیم رکھنے والا ہر فرد آسانی کے ساتھ دے سکتا ہے۔

میں یہاں پر اس سے زیادہ اس کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا، تقریروں اور ان مضامین میں جو ماہرین دینیات وقانون نے اس موضوع پر لکھے ہیں، اس پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے، اور ہمارے حقیقت پسند، صاف ذہن اور جرأت مند وزیر اعظم نے بھی اپنی ۲۷ فروری ۱۹۸۶ء کی تقریر میں اس کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے، اور اس پر روشنی ڈالی ہے۔

۳۔ مسلمانوں کی بے چینی اور اختلاف کی تیسری وجہ یہ ہے جو خالص اصولی، علمی، عقلی و انسانی اہمیت کی حامل ہے اور جس میں وہ حقیقتاً اپنے ہی دین و شریعت کے دفاع اور اس کی حفاظت کی خدمت انجام نہیں دے رہے ہیں، بلکہ وہ دوسرے مذاہب، فرقوں اور تمام علوم و فنون (SCIENCES) اور پورے نظام علم و فکر کے حصار بندی (PROTECTION) کا فرض انجام دے رہے ہیں، وہ یہ کہ کسی علم و فن میں مہارت خصوصی اور اس کی نمائندگی کا حق کس کو حاصل ہے، اور اس میں کس کا قول سند (AUTHORITY) سمجھا جائے گا، یہ ایک بین الاقوامی، بلکہ عالمی و دوامی حقیقت کو

تسلیم کرانے کی مقدس جد و جہد کے مرادف ہے، اور جو ہمارے پورے نظامِ فکر و نظامِ تعلیم کو انتشار و بحران (ANARCHY) اور (CRISES) سے بچاتا ہے ـــــ قرآن مجید کے الفاظ کی تشریح، اور سنّت اور فقہ کے احکام کی ترجمانی کا حق اس مذہب کے ماہرین فن (EXPERTS) اور (SPECIALIST SCHOLERS) کو حاصل ہے، یا ان کتابوں کے ترجمہ کی مدد سے عدالت کے فاضل ججوں اور ایسے دانشوروں کو حاصل ہے، جو نہ اس مذہب کی اصل زبان سے واقف ہیں، نہ انھوں نے اس کے مطالعہ میں کافی وقت اور ضروری محنت و توجہ صرف کی ہے مسلمان علماء اور عامّۃ المسلمین کی اس فکرمندی اور جد و جہد کا محرک فوری طور پر فاضل جج کے قرآنی اصطلاحات "متاع" اور "متعہ" اور "نفقہ" وغیرہ کی وہ تشریح ہے، جو انھوں نے جیسا کہ میں نے اوپر کہا، قرآن مجید کے ایک دو انگریزی ترجموں اور قانونی کتابوں کے سرسری مطالعہ کی بنا پر کی ہے، لیکن حقیقت میں اس سے ہر مذہب و فرقہ کا مذہبی نظام، عائلی قانون اور عقائد و عبادات تک خطرہ میں پڑ جاتے ہیں، اور جیسا کہ میں نے سلطان پور میں ہونے والے ایک عظیم جلسہ کی تقریر میں کہا تھا کہ ہندوستان کے ہر مذہب و فرقہ اور کمیونٹی کو اگر خطرہ کا احساس ہو جائے، اور ان کی دور بینی اور ذہانت اس حقیقت کو بھانپ لے کہ بقول شاعر۔ ؎

آج تم کل ہماری باری ہے

تو وہ مسلمانوں کے شکر گزار ہوں گے کہ انھوں نے اپنی آواز بلند کر کے اس خطرہ کے ـــــ سدّباب کا انتظام کیا، میں نے اس سلسلہ میں قرآن مجید کی بعض آیات کا بھی حوالہ دیا، میں نے یہ بھی کہا کہ میں متعدد عرب ممالک کی علمی مجلسوں ـــــ

(ACADEMIES) اور ماہرین قانون کی کمیٹیوں کا ممبر ہوں، میں اگر کسی عرب فاضل کو بھی وید، یا ہندو مذہب کے کسی مذہبی اصطلاح کی من مانی تعبیر، اس کی زبان، سیاق و سباق سمجھے بغیر اور اس کے ماہرین فن کی مدد لئے بغیر کرتے ہوئے سنوں گا، تو میں پہلا شخص ہوں گا، جو اس پر سختی سے اعتراض کرے گا، اور اس کے اس طرز عمل کو غلط کہے گا۔

اس سب کے علاوہ یہ مسئلہ مسلم کمیونٹی کے ایک مخصوص و محدود طبقہ سے تعلق رکھتا ہے جس کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے، طلاق کی شرح اور مطلّقہ عورتوں کی تعداد کے بارے میں عام طور پر مبالغہ سے کام لیا جاتا ہے، پھر عرصۂ دراز سے یہ سلسلہ جاری تھا، اور یہ مسئلہ کبھی کسی عوامی و قومی سطح پر نہیں آیا تھا مطلّقہ خواتین اپنے اپنے خاندانوں اور خونی رشتہ داروں، ماں باپ، بھائی بہن اور اگر اولاد ہے تو اولاد کے ساتھ سیکڑوں برس سے زندگی گزار رہی ہیں، میں نے مدراس کی ایک پریس کانفرنس میں جو ۱۰ر نومبر ۱۹۸۵ء کو ہوئی تھی جس میں ہندوستان کے چوٹی کے انگریزی اخبارات کے نمائندے بھی شامل تھے، بے ساختہ سوال کیا کہ آپ میں سے کون ہے جس نے چند مسلمان عورتوں کو سڑک پر کھڑا ہوا بھیک مانگتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے سنا کہ ہم بھوکوں مر رہے ہیں اور ہمارا کوئی خبر لینے والا نہیں! کسی طرف سے جواب نہیں آیا کہ ہم نے دیکھا ہے۔

اس سب کے بعد پھر یہ قانون مسلمانوں کے لئے بنایا گیا، اس کا نفاذ و اطلاق مسلمانوں پر ہوتا ہے، اس کے لئے ہمارے دوسرے عزیز و معزز ہم وطنوں کو جن کی خواتین پر یہ قانون لاگو نہیں بے چین اور مضطرب ہونے کی کوئی وجہ نہیں،

لیکن مسلمانوں کے اختلاف اور احتجاج کا سلسلہ شروع ہوا تو سارے ملک میں اور خصوصیت کے ساتھ پریس میں اور خاص طور پر انگریزی ہندی پریس میں ناگواری طنز و تعریض و تضحیک کی ایک لہر دوڑ گئی، پھر جب ۲۱ فروری ۱۹۸۶ء کو یہ بل پارلیمنٹ کے نئے سیشن میں ٹیبل پر رکھ دیا گیا، اور ان مسائل کی فہرست میں آگیا جن پر پارلیمنٹ کو غور کرنا اور فیصلہ دینا ہے، تو ایسا معلوم ہوا کہ سارے ہندوستان میں خطرہ کی ایسی گھنٹی بج گئی جیسی (خدا محفوظ رکھے) ملک پر کسی بیرونی حملہ، یا ملک کے اندر کسی شدید وبا، یا کوہ آتش فشاں پھٹنے کے موقعہ پر بجنی چاہیئے، یہ اس احساس تناسب SENSE OF PROPORTION کے بھی خلاف ہے جس پر زندگی کا نظام چل رہا ہے، مسئلہ جس نسبت سے توجہ، فکر و پریشانی کا مستحق ہے اسی نسبت سے اس کی طرف توجہ اور اس میں توانائی صرف کرنے کی ضرورت ہے، رائی کا پربت بنانا نہ عقلِ سلیم کا تقاضا ہے، نہ عقلِ عملی (PRACTICAL WISDOM) کا

گاندھی جی کے اس اعلیٰ اخلاقی و اصولی موقف اور اس عاقلانہ قیادت کو سامنے رکھتے ہوئے، جس نے ایک ایسے مسئلہ میں جس کا تعلق ہندوستان کے مسلمانوں کے اندرونی حالات سے براہ راست نہ تھا، ہندوستان سے ہزاروں میل دور اور سمندروں پار خلافت کے مسئلہ سے تھا جس کا مرکز ترکی تھا، ہمارے ہم وطنوں اور اکثریت کے دانشوروں اور اخبار نویسوں اور مختلف پارٹیوں کے رہنماؤں کا موقف یہ ہونا چاہیئے تھا، کہ اگر وہ مسلمانوں کے موقف کی تائید نہ کریں تو کم سے کم غیر جانبدار اور خاموش رہیں کہ اس سے ان کے عائلی قانون، پرسنل لا، ان کی قومی زندگی اور ان کے طبقہ خواتین کے حقوق و تحفظ پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اس سے

ملک میں ایک خوشگوار فضا اور باہمی اعتماد کی کیفیت پیدا ہوتی، اس سے کہیں زیادہ ان کی توجہ کی مستحق خود ان کے فرقہ اور طبقۂ نسواں کی سیکڑوں، ہزاروں نئی بیاہی ہوئی دلہنوں کے جلائے جانے یا غیر طبعی طور پر ان کو ہلاک کر دینے کے وہ واقعات ہیں جن سے شاید اس لمبے چوڑے ملک میں کوئی دن خالی جاتا ہو، نیشنل پریس کی اطلاع کے مطابق صرف دہلی میں ہر بارہ (۱۲) گھنٹہ پر ایک نئی بیاہی دلہن کو جلا کر مار ڈالا جاتا ہے۔[۱] "TIMES OF INDIA" لکھنؤ کی اشاعت ۶ر اپریل ۱۹۸۶ء میں ایک خاتون کا بیان شائع ہوا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ ہندوستان میں غیر قانونی طور پر اسقاط حمل سے چھیاسٹھ لاکھ (۶۶.....) اموات ہوتی ہیں۔

مسلمانوں کو خطرہ اور قریب قریب یقین ہے کہ اگر اس جبری گزارہ کا قانون پاس ہو گیا، اور طلاق دینے والے سابق شوہر کو دوسری شادی تک (جس کا ہونا ضروری نہیں) اور اس کے نہ ہونے کی شکل میں مدت العمر گزارہ دینا (جس کی مقدار اندازہ ہے کہ مسلسل طریقہ پر گرانی اور معیار زندگی بڑھتے رہنے کی وجہ سے برابر بڑھائی جاتی رہے گی) ضروری ہوگا طلاق سے بچتے ہوئے (جو بعض اوقات زندگی کی ایک ناگزیر ضرورت بن جاتی ہے، اور جس کا اعتراف مغربی دانشوروں اور ہمارے ملک کے قانون سازوں نے بھی کیا ہے) اپنی ناپسندیدہ رفیقۂ حیات سے پیچھا چھڑانے کے لئے مسلمان بھی ایسے ہی عمل اختیار کریں گے جیسے نہایت سفاکانہ طریقہ پر بیوی کو رخصت کرانے کے بعد ہندوستان کے معاشرہ میں کثرت سے پیش آرہے ہیں، اگر خدانخواستہ یہ قانون پاس ہو گیا تو جو لوگ زندہ رہیں گے

---

[۱] قومی آواز دہلی ۱۰ر جون ۱۹۸۴ء

وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے یا اپنے کانوں سے سنیں گے۔

میں معذرت خواہ ہوں کہ ایک ایسے دوستانہ، خوشگوار اور پُراعتماد مجلس میں جو ملک کے اصولی اور بنیادی مسائل پر غور کرنے کے لئے جمع ہوئی ہے، میں نے ایک ایسے مسئلہ کا ذکر اتنی تفصیل کے ساتھ کیا جو مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہے، لیکن اس کا ذکر کئے بغیر حالات کا صحیح جائزہ اور ملک کو صحیح رُخ پر لگانے اور اپنی توانائیوں اور صلاحیتوں کو ملک و انسانیت کی خدمت پر صرف کرنے کا کام نہیں کیا جا سکتا۔

ملک کے لئے صحیح اور محفوظ راستہ

سچی بات تو یہ ہے کہ ہمارے ملک کے بقاء، ترقی، عزت و استحکام اور اس کا معاصر دنیا اور اس خطرناک و پیچیدہ عالمی صورت حال میں اپنا شایان شان کردار ادا کرنے کے لئے صحیح، محفوظ، باعزت اور بے خطر راستہ وہی ہے جو تحریک آزادی کے مخلص دانشور اور بلند قامت و قیمت رہنماؤں پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا آزاد اور ان کے ساتھیوں نے تجویز کیا تھا اور وہ سچے سیکولرزم، صحیح جمہوریت اور ہندو مسلم اتحاد کا راستہ ہے خواہ وہ کتنا طویل اور مشکل ہو، اس کے علاوہ جو راستہ تجویز کیا جائے گا، اس سے خواہ عارضی و وقتی طور پر کامیابی حاصل ہو ملک کے لئے تباہ کُن اور ان قربانیوں پر پانی پھیرنے والا ہے، جو جنگ آزادی میں عمل میں آئیں، اور ملک کو ایسی مشکلات و مسائل سے دوچار کرنے والا ہے، جن کا کوئی حل نہیں ہے۔

ملک کے لئے تین بڑے خطرے

اب میں مذہب، انسانی تاریخ، فلسفہ اور اخلاق کا ایک طالب علم ہونے کے ناطے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں (اور مجھے اندیشہ ہے کہ شاید دوسرا شخص جس پر سیاسی طرزِ فکر غالب ہے نہ کہے گا) کہ اس ملک کے لئے دو خطرے بڑے تشویشناک ہیں، اور آپ کی پہلی توجہ کے مستحق: ایک ظلم و تشدد کا رجحان، انسانی جان و مال اور عزت و آبرو کی بے قیمتی (خواہ اس کا تعلق کسی فرقہ سے ہو) جس کا ظہور فرقہ وارانہ فسادات، طبقاتی اونچ نیچ کی بناء پر پورے پورے خاندانوں اور محلوں کی صفائی، تھوڑے سے مالی فائدہ کے لئے انسان کی جان لے لینا، سفاکانہ جرائم، اور مظالم کی کثرت اور سب کے آخر میں (لیکن سب سے زیادہ شرمناک حقیقت) مطلوب و متوقع جہیز نہ لانے پر نئی بیاہی دلہنوں کو جلا دینا، یا زہر دے کر مار دینا اور ان سے پیچھا چھڑانا ہے۔

جو لوگ مذہب پر یقین رکھتے ہیں، ان کے لئے تو یہ سمجھنا بہت آسان ہے کہ اس کائنات کا پیدا کرنے والا اور چلانے والا جو ماں سے زیادہ محبت کرنے والا اور مہربان ہے، اس عمل سے خوش نہیں ہو سکتا اور اس کو زیادہ دن برداشت نہیں کرے گا، اور اس کے نتیجہ میں ہزاروں کوششوں اور قابلیتوں کے باوجود کوئی ملک پنپ نہیں سکتا، اور وہ معاشرہ زیادہ دن باقی نہیں رہ سکتا، لیکن جو لوگ مذاہب پر اعتقاد نہیں رکھتے وہ اس تاریخی حقیقت سے واقف ہیں کہ اس سے کم درجہ کے ظلم اور سفاکی کی وجہ سے بڑی بڑی شہنشاہیاں اور وہ تہذیبیں

جن کا کسی زمانہ میں ڈنکا بجتا تھا، اور آج بھی تاریخ وادب کے صفحات پر ان کے روشن نقوش ہیں، زوال کا شکار ہوگئیں، اور داستان پارینہ بن کر رہ گئیں، اس صورت حال کی طرف فوری توجہ کی ضرورت ہے، سیاسی مسائل اور انتخابی مہم سے زیادہ اس کے خلاف طوفانی مہم چلانے کی ضرورت ہے، اس کے لئے گاؤں گاؤں، محلہ محلہ جانے کی ضرورت ہے، سخت قوانین، عبرتناک سزاؤں، ابلاغ عامہ کے ذرائع سے کام لینے اور انتظامیہ کو سخت سے سخت قدم اٹھانے کی ضرورت ہے، ورنہ نہ بانس رہے گا نہ بانسری۔

دوسرا خطرہ فرقہ پرستی، جارحیت و تشدد کے کھلے رجحانات ہیں جن کے سلسلہ میں ادنی سی رعایت، لچک اور نرمی سے وقتی طور پر خواہ کچھ فائدہ پہونچ جائے یا پریشانی سے بچا جا سکے، ملک کو زمین دوز اور دھماکہ خیز سرنگوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دینا ہے، جو بالآخر ملک کو لے ڈوبے گی، گاندھی جی اس حقیقت کو خوب سمجھتے تھے کہ فرقہ وارانہ منافرت، تشدد اور جارحیت، پہلے ملک کی آبادی کے دو اہم عنصروں (ہندو مسلم فرقوں) کے درمیان اپنا کام کرے گی، پھر یہی ذیلی مذہبی اختلافات، طبقات اور برادریوں کی صف آرائی اور نسلی، لسانی، صوبائی وعلاقائی تعصبات کی شکل میں ظاہر ہوگی، اور جب یہ کام بھی ختم ہو جائے گا تو وہ آگ کی طرح (جب اس کو جلانے کے لئے ایندھن نہ ملے تو اپنے کو کھانے لگتی ہے) ملک کو اور امن پسند شہریوں کو اپنا لقمہ بنالے گی، اور یہ ملک تباہ ہو کر رہ جائے گا۔

اس لئے اس جارحانہ احیائیت (AGRESSIVE REVIVALISM)

تشدد، ایک ہی فرقہ سے مطالبات اور اس پر تنقید کا سلسلہ، اپنے کو بالکل بدل دینے اور اپنے ملّی و تہذیبی و مذہبی تشخصات سے دست بردار ہو جانے کا مسلسل مطالبہ، سیکڑوں اور ہزاروں برس کی سوئی ہوئی بلکہ مری ہوئی تاریخ کو دوبارہ جگانا اور زندہ کرنا[۱]، جو تبدیلیاں صدیوں پہلے (اچھی یا بری) ہوئیں، اور ان کو اس ملک کے حقیقت پسند، فراخ دل اور عزت مند شہریوں نے صدیوں گوارا کیا، ان کے سفر کو پہلے قدم سے شروع کرنا اور ان کی تلافی کی کوشش اس ملک کو ان نئے مسائل و مشکلات سے دوچار کرے گی جن کا مقابلہ کرنے کی اس ملک کو نہ فرصت ہے نہ ضرورت، اور اس طرح حکومت، انتظامیہ اور دانشور طبقہ کی توانائی بے محل صرف ہوگی جس کی ملک کو اپنے تعمیری کاموں، سالمیت و استحکام میں ضرورت ہے، اس لئے اس شگاف کو جبکہ وہ معمولی توجہ اور مسالہ سے بند ہو سکتا ہے، اس سے پیشتر بند کر دیا جائے، جب وہ ہاتھیوں سے بھی بند نہیں ہو سکے گا، ملک کے اس عمومی و بنیادی مفاد کی خاطر کسی کی ناراضگی یا الیکشن کے نتائج پر اثر پڑنے یا کسی ریاستی و مقامی انتظامیہ کی ناگواری کا خیال نہیں کرنا چاہئے کہ ملک ان سب چیزوں سے زیادہ عزیز اور اصول، مصالح و فوائد پر

---

[۱] جس کا مظاہرہ کسی شہرت یا کہانیوں اور روایتوں کی بنیاد پر مسجد کو مندر میں تبدیل کرنا اس میں مورتیاں رکھنے کا وہ عمل ہے جس کی سب سے زیادہ انتشار انگیز اور سنگین مثال بابری مسجد اجودھیا کا واقعہ ہے، متعدد مسلم و غیر مسلم مؤرخین اور تحقیقی کام کرنے والوں نے دعویٰ کیا ہے کہ اس کا کوئی تاریخی و علمی ثبوت نہیں کہ بابر نے کسی مندر یا رام جنم بھومی کو مسجد میں تبدیل کیا، یہ شروع سے مسجد ہے۔

مقدّم ہے۔

اصول پسندی کی ایک روشن مثال

میں اس اصول پسندی کی ایک مثال پیش کرتا ہوں، جو ملک کے عظیم رہنما اور پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے پیش کی۔

۱۹۵۰ء میں جب کانگریس پر بابو پرشوتم داس ٹنڈن جی کی قیادت میں (جو کانگریس کے صدر ہو گئے تھے) فرقہ پرست عنصر غالب آرہا تھا، اور وہ کانگریس کو سیکولزم اور ہندو مسلم اتحاد کے بجائے جس کی بنیاد گاندھی جی، جواہر لال جی اور مولانا آزاد نے ڈالی تھی، فرقہ پرستی اور ہندو احیائیت HINDU REVIVIOLISM کی طرف پھیرنا چاہتے تھے، اور جمہوریت و اکثریت کے احترام اور اس کی پیروی میں جواہر لال جی سے بھی اس کی توقع کر رہے تھے کہ وہ اپنے عمر بھر کے خیالات اور سوچنے کے طرز کو چھوڑ کر کانگریس میں اپنے کے لئے اس کو اختیار کریں گے، جواہر لال جی نے اس سے انکار کر دیا، اس موقع پر انھوں نے جو تقریر کی وہ ہندوستان کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے، گاندھی نگر ناسک میں ۲۱ ستمبر ۱۹۵۰ء کو انھوں نے فرمایا۔

"میں جمہوریت پسند نہیں ہوں، اگر اس کا یہ مطلب لیا جاتا ہو کہ میں کسی ہجوم کی رائے کے سامنے جھکوں، میں کبھی ایسی بات نہیں کروں گا جس کے غلط ہونے کا مجھے یقین ہو، اور عوام (ہجوم) چاہتے ہوں کہ اس غلط بات کو میں مانوں ایسی صورت میں یہ ممکن ہے کہ اگر کانگریس چاہے تو میں کانگریس سے باہر نکل کر

انفرادی طریقہ پر اپنے خیالات کے لئے لڑوں۔"

"کچھ لوگ مجھ سے آکر کہتے ہیں کہ مجمع فلاں بات نہیں مانتا اور جمہوریت کی آواز آگے بڑھ رہی ہے، دراصل یہ بزدلوں کی دلیل ہے، اگر جمہوریت کا مطلب ہجوم کے آگے جھکنا ہے تو ایسی جمہوریت کو جہنم واصل ہونا چاہئے اس قسم کی ذہنیت جہاں کبھی سر اٹھائے گی میں اس کے خلاف لڑوں گا، ہاں جمہوریت مجھ سے وزارت چھوڑنے کو کہہ سکتی ہے، میں اس کا حکم مانوں گا، اگر کانگریسی یہ چاہتے ہیں کہ وہ آنے والے انتخابات میں چند ووٹ حاصل کرنے کے لئے اپنے اصول و نظریات چھوڑ بیٹھیں تو کانگریس مردہ ہو جائیگی، مجھے ایسی لاش کی ضرورت نہیں ہے[1]۔"

تیسری چیز جو فوری توجہ کی مستحق اور تشویش کا باعث ہے، وہ اخلاقی وانتظامی انتشار CORRUPTION ہے، جو اس حد تک پہونچ گیا ہے جس کی نظیر کم سے کم مجھے اس ملک کی تاریخ میں اس سے پہلے نہیں ملی، آپ اس سلسلہ میں سرکاری رپورٹوں اور ملک کے نظم و نسق کی ظاہری ٹیپ ٹاپ اور ترقی کو نہ دیکھئے، عام شہریوں، متوسط درجہ کے آدمیوں اور ان لوگوں سے پوچھئے جن کا عدالتوں، دفاتر، ریلوے، ہوائی سروس، پولیس، تھانوں، ٹیلی فون، ہسپتالوں، سرکاری ٹھیکوں اور زندگی کے مختلف شعبوں سے کام پڑتا رہتا ہے، رشوت کے بغیر ادنیٰ درجہ کا کام نہیں ہو سکتا، پیسہ کے ذریعہ ہر کام کرایا جا سکتا ہے، ہر مجرم کو چھڑایا جا سکتا ہے، ہر شریف انسان کو پھانسا

---

[1] قومی آواز۔ لکھنؤ۔ ۲۲ ستمبر ۱۹۵۰ء

جاسکتا ہے، ہر طرح کا غلط فیصلہ حاصل کیا جاسکتا ہے، ہر جگہ فساد کرایا جاسکتا ہے، یہاں تک کہ ملک کے راز بھی بیچے جاسکتے ہیں، دواؤں اور غذاؤں میں ملاوٹ ہورہی ہے، طبی امداد ملنی مشکل ہورہی ہے، مریضوں کے لئے جو انتظامات ہیں وہ بیکار جارہے ہیں، سنگدلی اپنی انتہا کو پہونچ گئی ہے، ریلوے ہوائی سروس میں رشوت کی گرم بازاری سے حکومت کو روزانہ لاکھوں، کروروں روپے کا نقصان ہورہا ہے۔

اس سب کی جڑ میں پیسہ کی حد سے بڑھی ہوئی محبت، خدا کا خوف دل سے نکل جانا اور انسان سے ہمدردی، ملک سے وفاداری اور اس کے مفاد کو ترجیح دینے اور اس کے نقصان کا خیال رکھنے کا جذبہ ختم ہوجاتا ہے، ایسی صورت میں ملک صنعتی طور پر، سیاسی طور پر، خارجی تعلقات کی بنیاد پر ترقی اور تعلیم کی اشاعت اور خواندگی کا تناسب بڑھ جانے کے باوجود تیزی سے زوال کی طرف جارہا ہے، لوگ زندگی سے عاجز ہیں، اور آخری شرم و ناکامی کی بات یہ ہے کہ انگریزوں کے دورِ غلامی کو یاد کرتے اور اس کی تمنا کرتے ہیں، جب انتظامیہ چوکس تھا، ریلیں وقت پر چلتی اور پہونچتی تھیں، ہسپتال اطمینان اور خوشی اور خدمت و راحت کے ٹھکانے تھے، نوجوان اپنی محنت و لیاقت سے پاس ہوتے تھے، تقرریاں اور ترقیاں قابلیت اور استحقاق کی بنا پر ہوتی تھیں، اب یہ سب چیزیں خواب و خیال ہوگئیں۔

ہندوستانی پریس اور اخبار نویسوں سے شکایت

حضرات! چونکہ آپ کو کسی روایتی سیاسی کانفرنس میں نہیں بلکہ ایک ایسی بے تکلف مجلس میں شرکت کی دعوت دی گئی ہے، جس میں ہم کو ایک ایسی جماعت کی طرح جو ایک کشتی پر سوار ہے، یا ایک ایسے افراد خاندان کی طرح جو کسی تقریب میں جمع ہیں، ایک دوسرے سے بے تکلف اپنے دل کی بات کہنے اور شکوہ و شکایت کا حق ہے، میں اپنے ملک کے انگریزی، ہندی اور اُردو اخبار نویسوں اور صحافیوں سے کچھ کہنے کی جرأت کرتا ہوں۔

آپ سے زیادہ کون اس بات کو جانتا ہے کہ یگانگت اور محبت بڑھانے اس کے بالمقابل دو فرقوں اور خود ایک فرقہ کے افراد میں تلخی و بدگمانی اور نفرت و کراہت پیدا کرنے میں پریس کو جو دخل ہے، وہ کسی دوسرے ادارہ کو نہیں، میں نے ایک مرتبہ اخبار نویسوں اور ایڈیٹروں کی ایک کانفرنس کے نمائندوں کو جو چند سال پہلے لکھنؤ میں ہوئی تھی، خطاب کرتے ہوئے فارسی کا ایک مصرعہ ایک حرف کی ترمیم کے ساتھ پڑھا تھا، شاعر اپنے محبوب سے کہتا ہے۔ ع

زیر قدمت ہزار جان است

تمہارے قدم کے نیچے ہزاروں جانیں ہیں، میں نے صرف ایک حرف بدل کر کہا۔ ع

زیرِ قلمت ہزار جان است

آپ کے قلم کے نیچے ہزار جانیں ہیں، میں یہ نہیں کہوں گا کہ آہستہ چلیں یا

بالکل نہ چلیں، میں کہوں گا کہ احتیاط سے چلیں، میں نے ۱۰ نومبر ۱۹۸۵ء میں مدراس کی پریس کانفرنس میں جو مسلم پرسنل لا کے مسئلہ کے سلسلہ میں ہوئی تھی، کہا تھا کہ میں اخبار کو ایک سچا اور ایمان دار کیمرہ سمجھتا ہوں جس کا کام یہ ہے کہ وہ تصویر کو (اس سے قطع نظر کہ وہ حسین ہے یا بھدّی) اپنے اصلی رنگ روپ میں پیش کردے، ملک میں پیش آنے والے واقعات، مختلف فرقوں کے جذبات و تکلیفات منعقد ہونے والے احتجاجی جلسوں اور جلوسوں کو اپنے صحیح حجم (BULK) حاضرین کی تعداد کے صحیح اندازہ، اور مقررین و سامعین کے اصلی جذبات و کیفیات کے ساتھ پیش کردے تاکہ حکومت، ملک اور پبلک کو صورت حال کا صحیح اندازہ ہوسکے، اور وہ اپنے انتظامی، اخلاقی فرائض اور ذمہ داریاں محسوس کریں، میں اس حد تک اس کو ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر ہپیز (HIPPIES) یا (ہم سے آپ سے دور) کوڑھیوں یا متعدی امراض رکھنے والوں کی کوئی کانفرنس ہو، تب بھی ہم کو اس کو اس کے حجم کے ساتھ پیش کرنا چاہیئے، تاکہ ملک کے اصلاحی، تربیتی ادارے حفظان صحت کا نظام اور سماجی سدھار کا کام کرنے والے (SOCIAL - WORKERS) اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں، اور وقت اور کام کی وسعت و ضرورت کے مطابق تیار ہوکر میدان میں آئیں، ملک میں کسی مریضانہ علامت کے ظاہر ہوتے یا کسی غلط اور تخریبی رجحان کو پورے طور پر نمایاں نہ کرنے سے ملک و معاشرہ سخت خطرہ سے دوچار ہوسکتا ہے، اور اقوام و ملل کی قدیم تاریخ میں اس کی بہت سی شہادتیں موجود ہیں، ایک وسیع ملک، ایک ترقی یافتہ و طاقتور حکومت، ایک مہذب و تعلیم یافتہ معاشرہ، بروقت خطرہ

اور غیر صحت مندانہ رجحانات اور کوششوں کو روکنے سے غفلت برتنے کے نتیجہ میں بار ہا دائمی زوال کا شکار ہو گیا، اور دنیا کی تاریخ میں داستان پارینہ بن کر رہ گیا ہے، ہمارے معزز و عزیز اخبار نویسوں اور ایڈیٹروں کو اپنے ایڈیٹوریلز اور اپنے اظہار رائے کے کالموں میں اپنے نقطۂ نظر اور اپنی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے اظہار کا پورا حق ہے اور ان کے اس حق کو کوئی چھین نہیں سکتا لیکن واقعات کی رپورٹنگ اور مختلف فرقوں اور جماعتوں کے جذبات، شکایات، اور مطالبات کے روئیداد پیش کرنے میں ان کو کسی طرح کی رنگ آمیزی اور جانب داری سے کام نہیں لینا چاہیئے۔

ملک کی سب سے بڑی اقلیت اور فرقہ (مسلمانوں) کو شکایت ہے کہ ان کے جلسے و جلوسوں، احتجاج اور مظاہروں، اور یہاں تک کہ ان کی ملی تقریبات اور مجلسوں کی صحیح تصویر ہندوستانی پریس میں آنے نہیں پاتی، اور محض اخبارات پڑھ کر کسی کو ان کے احساس کی شدت، ان کی بے چینی، بے اطمینانی اور ان کی اکثریت کے جائز آئینی مطالبے کا اندازہ نہیں ہو سکتا، یہ نہ صرف اس مخصوص اقلیت اور فرقہ کے لئے مُضر اور اس کے ساتھ ناانصافی ہے، بلکہ ملک و حکومت دونوں کے لئے نقصان رساں اور ان کے حق میں بدخواہی اور بداندیشی ہے کہ ان کو واقعہ کی سنگینی کا علم نہ ہونے پائے، اور وہ تھوڑی کوشش سے اس کا تدارک و علاج نہ کرسکیں، جو بڑھ جانے کے بعد بڑی کوشش سے بعض اوقات ممکن نہیں ہوتا ہے۔

میں آپ کی اجازت سے بطور نمونہ اس سلسلہ میں اپنے چند مشاہدات

پیش کرنا چاہتا ہوں، ۲۷ر ۲۸ر دسمبر ۱۹۷۲ء میں بمبئی میں پہلی مرتبہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام عمل میں آیا، اور Y.M.C.A مدن پورہ کے میدان میں ایک پبلک جلسہ ہوا، جس میں محتاط اندازہ کے مطابق ایک لاکھ کے قریب مجمع تھا، اسی دن آنجہانی عبدالحمید صاحب دلوائی کی قیادت میں ایک مظاہرہ ہوا، جس میں چند درجن سے زیادہ آدمی نہیں تھے، مسلمانوں نے اس پر اپنی سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا، پولیس نے مظاہرین کو اپنے گھیرے میں لے لیا، ورنہ ان کو سخت حالات سے دوچار ہونا پڑتا، میں نے خود اگلے روز بمبئی کے انگریزی اخبارات پڑھے، اس میں مسلم پرسنل لا بورڈ کے سلسلہ کے جلسہ کا بہت معمولی طور پر تذکرہ تھا، لیکن دلوائی صاحب کے مظاہرہ کو بہت نمایاں طریقہ پر دکھایا گیا تھا، جس سے ناواقف آدمی سمجھتا کہ اس میں ہزاروں آدمی شریک تھے، اور مسلمانوں کی نمائندگی یہی جلوس کرتا تھا، اس عدم توازن اور حقائق کو نمایاں نہ کرنے کا جو اثر انتظامیہ، ملک کے دانشور طبقہ اور برادران وطن پر ہو سکتا ہے، اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔

دوسری مثال قریبی زمانہ کی ہے، ۶ر ۷ر اپریل ۱۹۸۵ء میں کلکتہ میں مسلم پرسنل لا بورڈ کا اجلاس ہوا، ۷ر اپریل ۱۹۸۵ء کو شہید مینار میدان میں شام کو پبلک جلسہ ہوا، جس میں اچھے تجربہ کاروں کا اندازہ ہے کہ پانچ لاکھ آدمی شریک تھے، جہاں تک نظر کام کرتی تھی، انسانوں کا جنگل نظر آتا تھا، میں بورڈ کا صدر ہوں اور اس جلسہ میں بطور خود موجود تھا، اور تقریر بھی کی، اگلے دن میں آسنسول کے لئے روانہ ہو رہا تھا، میں نے ہوڑہ اسٹیشن پر جتنے

انگریزی اخبارات مل سکے حاصل کئے، جو اخبارات مجھے ملے ان میں کہیں اس جلسہ کا تذکرہ نہ تھا، ایک انگریزی اخبار میں ان الفاظ میں خبر دی گئی تھی:

"HUNDREDS OF MUSLIMS ATTENDED" اب آپ ہی فرمایئے، نہ صرف باہر کے لوگوں کو بلکہ کلکتہ کے ان باشندوں کو بھی جن کو اس جلسہ کو دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا، صحیح صورتِ حال اور اپنے ہم وطن بھائیوں کے جذبات کی شدّت کا اندازہ کیسے ہو سکتا ہے، اور خود حکومت کی مشینری، عدلیہ، اور انتظامیہ اور ملک کا حقیقت پسند طبقہ اس کا مداوا کیسے کر سکتا ہے؟ مبالغہ نہ ہوگا اگر میں کہوں کہ سیکڑوں مثالوں میں سے یہ دو مثالیں ہیں، جو میں نے پیش کیں۔

موجودہ مسئلہ مسلم پرسنل لا بل کے سلسلہ میں بھی یہی تلخ تجربہ ہوا کہ ہمارے انگریزی و ہندی اخبارات نے (بہت خفیف استثناء کے ساتھ) خبریں دینے، تبصرہ کرنے، تردیدی و مخالفانہ مضامین و مراسلات شائع کرنے میں میونسپلٹی اور کارپوریشن کے شہری قانون ONE WAY TRAFFIC کا مظاہرہ کیا ڈھونڈنے پر بھی مطلّقہ خواتین کے حقوق کے تحفّظ کے زیر بحث بل کے حامیوں یا اس کی وضاحت کرنے والوں کا کوئی مضمون یا مراسلہ دیکھنے میں نہ آیا، اس طرح یہ اخبارات و رسائل (مجھے معاف کیا جائے) ایک ہی نقطۂ نظر کے ترجمان اور پُر جوش حامی تھے، جو اکثریتی فرقہ کی اکثریت اور مسلم فرقہ کے انگلیوں پر گنے جانے والے چند افراد کا نقطۂ نظر اور طرزِ فکر تھا، اور اس سے ملک و بیرون ملک کا کوئی اخبار بیں (جس کی معلومات و خیالات کا انحصار اخبارات کے مطالعہ پر ہو)

اس بے چینی، جوش و خروش اور بے نظیر وحدت، فکر و خیال کا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا، جو ہندوستان کے دس یا پندرہ کروڑ مسلمانوں میں پائی جاتی ہے، اور جس سے واقف ہونا ہر حقیقت پسند، جمہوریت اور آزادی رائے کا احترام کرنے والے محبّ وطن اور ذمہ دار انسان کا فرض ہے۔

آخر میں دہلی ہی کے (جہاں ہم جمع ہیں) نامور اردو شاعر مرزا غالب کا ایک شعر پڑھتے ہوئے آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے